R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy–15 P.

جلد ۲۷۔ شمارہ ۱۲ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ مارچ ۱۹۶۸ء

اداریہ

اردو گھر

جیسا کہ پچھلی اشاعت میں اعلان کیا جا چکا ہے ۲۳ مارچ کو شام کے ساڑھے پانچ بجے شریمتی اندرا گاندھی انجمن کی عمارت "اردو گھر" کا سنگ بنیاد راؤز ایوینیو میں رکھیں گی۔ اس موقع پر مجلس عام کے ممبروں، اور دہلی کے ادبی اور تہذیبی حلقوں کے ممتاز افراد کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔

"اردو گھر" انجمن کے ایک پرانے خواب کی تعبیر ہے۔ آزادی سے پہلے انجمن نے نئی دلی میں ایک پلاٹ حاصل کر لیا تھا مگر دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے حکومت نے اسے واپس لے لیا۔ آزادی کے بعد ہم نے پھر کوشش کی، اور حکومت سے زمین کے لیے درخواست بھی کی، مگر عرصے تک شنوائی نہ ہوئی۔ بالآخر پروفیسر ہمایوں کبیر کی مدد اور مسٹر دھرم ویر کی اعانت سے جو اس وقت دہلی کے چیف کمشنر تھے، ہمیں حکومت سے رعایتی شرح پر زمین ملی۔ انجمن کے پاس تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ عمارت فنڈ میں موجود ہے۔ مگر اخراجات کا تخمینہ ساڑھے سات لاکھ کیا گیا ہے۔ ہم نے حکومت سے ایک گرانقدر عطیہ کی درخواست کی ہے۔ مگر ہمارا تکیہ دراصل اردو دوستوں پر ہے جن کے لیے موجودہ دور کی مشکلات کے باوجود پانچ چھ لاکھ روپیہ فراہم کرنا مشکل نہ ہونا چاہیے۔ انجمن کا کام اب تک بیشتر حکومت کی امداد سے چلتا رہا ہے مگر ہم اس صورت حال کو بدلنا چاہتے ہیں اور اردو دوستوں کی سرپرستی اور اعانت سے ہی انجمن کے سارے کام چلانا چاہتے ہیں۔ دہلی میں انجمن کی اپنی عمارت کی وجہ سے ایک طرف اردو زبان کی حفاظت کے لیے ہمیں زیادہ کارگر ہونے کا موقع ملے گا، دوسری طرف ہم وہاں طباعت کی سہولتوں کی وجہ سے اس کے ادبی کاموں کو اور بڑھا سکیں گے۔ پھر دہلی اردو کی جنم بھومی ہے، یہ اردو کا بڑا مرکز رہا ہے اور اب بھی ہے۔ یہ ہندوستان کا دل ہے۔ انجمن یہاں سے سارے ملک میں اپنے کاموں کی بہتر نگرانی کر سکتی ہے۔

یہ موقع تمام اردو دوستوں کے لیے بڑی مسرت کا ہے۔ ہم محبت اور دوستی کا ایک نقش جمیل بنانا چاہتے ہیں اور زبان و ادب کے تمام شیدائیوں اور تہذیب اور انسانیت کے تمام علمبرداروں سے اس کام میں تعاون کی درخواست کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ درخواست صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی ؂

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

پٹنہ میں بہار ریاستی اردو کانفرنس کی تیاریاں مکمل

پٹنہ ۸ مارچ جناب غلام سرور صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے بہار کے تمام اردو دوستوں، بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی تمام ضلعی شاخوں نیز ریاستی انجمن کے منتخب کردہ تمام کاؤنسلروں اور انجمن کے مجلس عاملہ اور کونسل کے تمام ممبروں کے نام ذیل کی اپیل کی ہے۔

پہلے کیا جا چکا ہے کہ ۳۰، ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو پٹنہ میں بہار ریاستی اردو کانفرنس کا انعقاد ہوگا۔ یہ کانفرنس انجمن اسلامیہ ہال مرادپور کے سامنے وسیع و عریض کھلے میدان میں ہوگی آج ہماری اردو تحریک جس موڑ پر پہونچ چکی ہے اس کے پیش نظر یہ کانفرنس ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہے وقت کا تقاضہ ہے کہ صوبہ بہار کے محبان اردو سر جوڑ کر بیٹھیں اور آئندہ کے فیصلہ کن اقدام باہم مل کر طے کریں۔ اس کانفرنس میں بمبئی، حیدرآباد، دلی، علی گڑھ، لکھنؤ، کلکتہ، مظفرپور، آسنسول اور بہار کے گوشے گوشے سے محبان زبان و ادب شرکت فرما رہے ہیں۔ کانفرنس کی تیاریاں شباب پر ہیں۔ اسے کامیاب بنانا ہر اردو دوست کا فرض ہے۔ آپ سب سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ ارکان مجلس استقبالیہ سے تعاون کر کے اسے کامیاب بنائیں۔ کانفرنس کے لیے مبلغ چھ ہزار روپیہ کا بجٹ تیار کیا جا چکا ہے۔ مجلس استقبالیہ کی فیس صرف پانچ روپیہ رکھی گئی ہے۔ ہر اردو دوست سے مجلس استقبالیہ کا ممبر بننے کی درخواست کرتا ہوں۔ نیز اہل ثروت حضرات سے خصوصی عطیہ مرحمت فرمانے کی اپیل کرتا ہوں۔ ہر مقامی شاخ کا کوٹہ صرف دس روپیہ مقرر کیا گیا ہے اور ضلعی شاخوں کا کوٹا پچاس روپیہ۔ تمام ضلعی اور مقامی شاخوں سے ہماری اپیل ہے کہ بلا تاخیر اپنی اپنی رقم ہمیں روانہ فرمادیں۔ ریاستی انجمن کی کونسل کے لیے جو رکن منتخب کئے جا چکے ہیں انجمن کے ضابطہ کی رو سے انہیں تین روپیہ سالانہ کی فیس رکنیت ادا کرنی ہوگی۔ کانفرنس اسی صورت میں کامیاب ہوگی جب زیادہ سے زیادہ تعداد میں اور ہر قصبہ، دیہات کے اور ریاست کے گوشہ گوشہ سے اردو دوست اس کانفرنس میں شریک ہوں۔

(مشیر)

ایک ہندوستانی اخبار کو اعزاز

نیویارک، مدراس سے ۹۰ سال نکلنے والا انگریزی روزنامہ ہندو کو ۱۹۶۷ء کا اعلیٰ صحافتی خدمات انجام دینے کے عالمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے یہ ایوارڈ ہر سال امریکی نیوز پیپر پبلشرز کی ایسوسی ایشن کی طرف سے دیا جاتا ہے۔

گورکی کے غیر مطبوعہ مخطوطات

ماسکو، میکسیم گورکی آرکائیوز، سوویت یونین کے اس عظیم ادیب کی سو سالہ سالگرہ کی تقریب کے سلسلہ میں گورکی کے کئی غیر مطبوعہ مخطوطات کی اشاعت کرے گا۔ طباعت کے لیے دی جانے والی کتابوں میں، گورکی کے غیر مطبوعہ مخطوطات کی ۱۲ویں جلد ہے جس کے مخطوطات کا زمانہ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۳۶ء ہے۔ اس کے علاوہ اپنے بیٹے کے نام گورکی کے خطوط "ہے۔ (تاس)

مبادیات تحقیق

نوجوان محققوں کی رہنمائی کے لیے اردو کی مبادیات تحقیق ادبی پبلشرز نے شائع کیا ہے اس کتاب میں مولف نے عالمانہ بحث کے بجائے عملی نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہے۔ یہ کتاب نئے محققین کے لیے بہت زیادہ کارآمد ہے اور ادبی پبلشرز ۸، شیفرڈ روڈ بمبئی ۸ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

حیدرآباد سے ایک ہفتہ وار اردو اخبار کا اجرا

حیدرآباد سے ایک ہفتہ وار اخبار "ترجمانِ حیات" جاری کیا جا رہا ہے۔ جو اس ماہ کے آخری ہفتہ میں منظر عام پر آئے گا۔ یہ اخبار جملہ مسائل کو حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھے گا۔ یہ اخبار ذیل کے پتہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

۴-۶۲-۸-۲۲، پرانی حویلی حیدرآباد - ۲

حاصل حسینی غازیپوری

اردو زبان

سوز و گداز، لطف و نزاکت لئے ہوئے
شوخی حسن و عشق کی فطرت لئے ہوئے
اردو ہے ارتباط و محبت لئے ہوئے

یہ اتحادِ قوم کی عزت ہے دوستو
اس میں خلوص اور اخوت ہے دوستو

یہ میرؔ کی نزاکتِ گفتار کی زبان
سوداؔ و سوزؔ و دردؔ کے اسرار کی زبان
شاہ نصیرؔ ذوقِؔ سخندار کی زبان

غالبؔ کی بادہ نوشی ہے مومنؔ کی آرزو
اس میں ہے داغؔ و سائلؔ و بیخودؔ کی گفتگو

ہیں شادؔ کی سترتیں حسرتؔ کی حسرتیں
حالیؔ کی وسعتیں ہیں تو شبلیؔ کی رفعتیں
دیکھو زبان اردو میں کیا کیا ہیں لذتیں

اقبالؔ کا ہے "شکوہ" عبادت سے کم نہیں
سیدؔ کا "کفر" روحِ شریعت سے کم نہیں

یہ ہے نہالؔ چند کی سرشارؔ کی زبان
منشی پریمؔ چند کے افکار کی زبان
یعنی دیا نسیمؔ کے اشعار کی زبان

چکبستؔ اور تلوکؔ کی پیاری زبان ہے
سب لوگ کہہ رہے ہیں ہماری زبان ہے

پھوٹی ہے اس سے ہند میں تہذیب کی کرن
سیکھے ہیں اس کے سائے میں ہم سب نے علم و فن
حاصل ہے اس کے فیض سے آزادیٔ وطن

ناموسِ ملک و قوم ہے بھارت کی شان ہے
ہر اک زباں کا رس لیے اردو زبان ہے

ادیبوں کی کانگریس

ایران کے تمام ادیبوں کی ایک کانگریس ۲۰۰۰ میں منعقد ہوری ہے یہ اپنی نوعیت کی پہلی کانگریس ہوگی جو ایران میں طلب کی گئی ہے اس اہم اور نمائندہ کانگریس کا افتتاح ایران کی ملکہ فرح پہلوی کریں گی کانگریس کی تیاریاں شروع کی جا چکی ہیں۔

غالب کے کلام کا بنگلہ میں ترجمہ

کلکتہ، انجمن ترقی اردو مغربی بنگال نے صد سالہ جشن غالب کے سلسلہ میں غالب کے کلام کو بنگلہ میں منتقل کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ بنگلہ اور اردو کے ادیبوں پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا گیا ہے جس نے انتخاب و ترجمہ کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس ترجمہ میں اصل متن بھی دیا جائے گا اور غالب کے سوانح اور ان کے فکر و فن پر تفصیلی مقدمہ شامل ہوگا۔

مولوی خدا بخش کے کتب خانہ کو قومی اہمیت کا ادارہ قرار دئے جانے کا بل

نئی دہلی، مرکزی وزارت تعلیم کے وزیر ریاست پروفیسر شیر سنگھ نے لوک سبھا میں ایک بل پیش کیا ہے جس کا مقصد خدا بخش لائبریری (پٹنہ) کو قومی اہمیت کا ادارہ قرار دینا ہے۔ مولوی خدا بخش خاں کا یہ کتب خانہ عربی اور فارسی کی نایاب قلمی کتابوں کا خزانہ ہے مولوی صاحب نے اپنی عمر بھر کے سارے سرمائے کو عوام اور اہل علم کے لیے وقف کر دیا تھا۔

"بوئے گل" کی اشاعت

"بوئے گل" اردو کی ان منظومات کا مجموعہ ہے جس میں اردو شعراء نے آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اس مجموعہ کے مرتب انگلو عربک کے شاعر سید نظر برنی ایم اے ہیں اور مکتبہ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

حنیف نقوی

کچھ نکات الشعرا کی ایک اور روایت کے سلسلے میں

دلی کالج میگزین کے میر نمبر (۱۹۶۲ء) میں "نکات الشعرا کی ایک اور روایت" کے عنوان سے جناب نثار احمد فاروقی نے ایک مضمون تحریر فرمایا ہے جس میں ایک مجہول الحال تذکرے کے چند منتشر اوراق کو "نکات الشعرا" مؤلفہ میر تقی میر کے اجزائے پریشاں قرار دے کر ان کے محتویات و مشتملات سے بحث کی گئی ہے۔ یہ اوراق مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سر سلیمان کلیکشن کے ایک مخطوطہ "متفرقات" میں منسلک ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کا خیال ہے کہ ان اوراق کا تعلق "نکات الشعرا" کے ایک قدیم نسخے سے ہے اور اس تذکرے کا متداول نسخہ اس "نقش اول" کا "مخفف یا ترمیم شدہ ایڈیشن" ہے۔ اپنے اس خیال کی بنیاد پر موصوف نے "آب حیات کا تنقیدی مطالعہ" کے دوسرے ایڈیشن میں ان کے مندرجات سے کچھ نتائج بھی اخذ کیے ہیں لیکن یہ ثابت کرنے کی ضرورت کہ ان کا تعلق واقعی میر کے تذکرے سے ہے، نہ فاروقی صاحب نے محسوس کی ہے اور نہ رضوی صاحب نے۔ پیش نظر سطور میں ہمارا موضوع بحث یہی بنیادی اور تحقیق طلب مسئلہ ہے۔

مذکورہ اوراق کی کل تعداد چھبیس ہے۔ بحالت موجودہ یہ غیر مسلسل بھی ہیں اور غیر مرتب بھی۔ مجموعی طور پر ان میں پچپن شاعروں کے حالات و اشعار مندرج ہیں۔ ان میں سے غلام احمد احمد (احسن الدین خاں) بیان، جودت (؟)، غلام مصطفٰی خاں ولی، مہربان خاں رند، محمد رضا رضا، سید علی سید، فتح علی شیدا، عیسوی (؟)، غلام محی الدین فلاحی، مرزا احمد ذکی لاہوری، قاسم علی قاسم، شاہ قلندر، مرتضٰی خاں مرتضٰی (قمرالدین) منت اور امیر عسکری، نالاں کے تراجم اور دوسرے کئی شعرا کے بیشتر اشعار نکات الشعرا میں موجود ہیں۔ میر مہدی بیدار، یقین اور ولی کے اشعار باقی ہیں لیکن تعارفی حصے ضائع ہو چکے ہیں۔ بعض شعرا کے حالات لفظ بہ لفظ میر صاحب کی تحریر کے مطابق ہیں اور بعض جگہ معمولی ترمیم یا تلخیص کی صورت نظر آتی ہے جب کہ بعض مقامات پر عبارات میں اس حد تک تغیر ہوا ہے کہ میر صاحب کے معروف بیانات اور مخصوص جملوں کی نوعیت بالکل ہی بدل گئی ہے۔ حتیٰ کہ ایک جگہ ایک شاعر کی نسبت جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے دوسری جگہ اس کے بارے میں کچھ اور کہہ کر وہ تمام باتیں کسی دوسرے شاعر سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں تمام ظاہری و معنوی اختلافات کو نظر انداز کر کے محض چند شعرا کے اشتراک اور ان سے متعلق تعارفی تحریروں کی کلی یا جزوی مطابقت کی بنا پر یہ فرض کر لینا کہ یہ اوراق نکات الشعرا کے کسی قدیم تر نسخے کے باقیات ہیں، آداب تحقیق کے منافی ہی نہیں، بے معنی بھی ہے۔

جہاں تک اس رائے کا تعلق ہے کہ یہ اوراق نکات الشعرا کے نقش اول یا کسی قدیم تر نسخے کا حصہ ہیں اور اس تذکرے کا جو نسخہ ہم تک پہنچا ہے وہ اس اصل یا قدیم نسخے کا ملخص یا ترمیم شدہ ایڈیشن ہے، اس قسم کے کسی بھی دعوے کو پورے وثوق کے ساتھ رد کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل امور غور طلب ہیں۔

(الف) نکات الشعرا میں میر سوز کا ذکر میر تخلص کے تحت اور ان اوراق میں سوز تخلص کے ساتھ کیا گیا ہے اور یہ امر طے شدہ ہے کہ سوز نے موجودہ تخلص اول الذکر تخلص میر سے (میر صاحب کے حق میں) دستبرداری کے بعد اختیار کیا تھا۔ معاصرین کے بیانات سے قطع نظر ان کا یہ مقطع بھی تبدیلی کی اس نوعیت کی جانب اشارہ کرتا ہے ؎

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ ہوئے ہزار حیف　　اب جو کہیں ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

(ب) تذکرۂ میر کے متداول نسخے میں میر قمرالدین منت کے حالات شامل نہیں لیکن ان اوراق میں ان کا ذکر موجود ہے اور انھیں نواب وزیر عماد الملک کا ملازم بتایا گیا ہے۔ میر نظام الدین ممنون (فرزند منت) کی روایت کے مطابق منت کا سال ولادت[1] ۱۱۵۸ھ (۴۶-۱۷۴۵ء) ہے اور ان اوراق میں ان کے تعارف کی شمولیت کے وقت ان کی عمر کسی طرح انیس بیس سال سے کم نہ ہوگی جب کہ نکات الشعرا کا موجودہ نسخہ ان کی پیدائش کے صرف سات برس بعد ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) میں مرتب ہوا ہے۔ اس لیے ان اوراق میں ان سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بلا شبہ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء کے کئی برس بعد کی تحریر ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی اور جناب نثار احمد فاروقی کے بیانات کی دوسری اور اہم ترین شق یہ ہے کہ یہ اوراق میر صاحب کے نتائج قلم ہیں۔ ہماری نظر میں پہلی رائے کی طرح یہ فیصلہ بھی ناقابل قبول ہے کیونکہ ان اوراق کے مندرجات میں بکثرت ایسے قرائن و شواہد موجود ہیں جن کی روشنی میں اضافہ و حذف اور ترمیم و تغیر کے اس عمل میں میر صاحب کے قلم کا دخل حد درجہ بعید از امکان معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر:

(الف) جعفر علی (دکنی) کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے:

"مرزا جعفر بسیار مائل بہ ہزل بود۔ بندہ با او یک ملاقات کردہ ام۔[2] شعر ہزل خود می خواند و مردم را بخندہ می آورد و خود نمی خندید مگر گاہے تبسم می کرد۔ وطنش شاہجہاں آباد است"

نکات الشعرا میں جعفر کے متعلق میر صاحب کا بیان اس سے بالکل مختلف ہے اور یہ تمام باتیں جو یہاں جعفر کی طرف منسوب ہیں وہاں محمد شاکر ناجی کے بارے میں کہی گئی ہیں۔ اس اختلاف کے علاوہ ایک فرق یہ بھی ہے کہ میر صاحب نے جعفر کے نمونۂ کلام میں اردو کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے جو عالمگیر کے پسر چہارم محمد اعظم شاہ کی ہجو سے تعلق رکھتا ہے اور انتہائی فحش ہے، جبکہ ان اوراق میں ان کے نام سے جو اشعار پیش کیے گئے ہیں وہ بالعموم اس قسم کے ہیں ؎

طرفہ حالت ہے بتاں سخت گرفتاری ہو
پوچھتا کوئی نہیں کیا تجھے بیماری ہو
بسکہ شب آن کے ہاتف نے کہا ہے جعفر
شاد ہو وصل کی کچھ ان دنوں تیاری ہو

قطع نظر اس سے کہ بظاہر یہ اشعار زٹلی کی بجائے کسی اور ہی جعفر کی تصنیف معلوم ہوتے ہیں، یہ بات بالکل قرین قیاس نہیں کہ ایک تذکرہ نگار جسے ایک

۱؎ دیوان ممنون قلمی مخزونہ مولانا آزاد سینٹرل لائبریری بھوپال ورق ۲۰ ب

۲؎ نکات الشعرا طبع ثانی ص ۲۴

جگہ صدہا بدقسمت کلام بطور نمونہ پیش کرنے میں کوئی باک نہ رہا ہو، دوسری جگہ صرف ایسے اشعار کے انتخاب پر اکتفا کرے جو کسی طرح شاعر کے غالب رجحانِ طبیعت کی نمائندگی نہیں کرتے۔

(ب) سید عبدالولی عزلت کو ان اوراق میں مرزا مظہر جانجاناں کا شاگرد ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ ان خلافِ واقعہ ہے اور چونکہ میر صاحب عزلت سے ذاتی طور پر واقف تھے، اس لئے اس قسم کی غلط بیانی ان کے نامۂ اعمال میں درج نہیں کی جا سکتی۔

(ج) سراج اورنگ آبادی کے بارے میں ان اوراق کے مرتب کا بیان ہے کہ "ابتدائے جوانی در شاہجہان آباد آمدہ، چنانچہ مشقِ سخن ریختہ در نیجا می کرد" سراج (۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء تا ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳-۶۴ء) میر صاحب کے ہم عصر ہیں اور دہلی میں ان کے ورود اور مشقِ سخن کے متعلق اس بیان کے علاوہ کوئی دقیع یا غیر دقیع شہادت موجود نہیں اس لیے یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ یہ جملے میر صاحب کے قلم سے نکلے ہوں گے، بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ بعد شباب سے تقریباً ساٹھ سال کی عمر تک ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا، اور حصۂ اول ایڈیشن کی ترتیب کے وقت یعنی سراج کی وفات سے بارہ سال قبل تک وہ ذاتی طور پر ان سے قطعاً ناواقف تھے۔ سراج جیسے شاعر کا دہلی آنا اور میر صاحب کا ان کے ورود سے عرصۂ دراز تک بے خبر رہنا بڑا بعید از قیاس ہے۔

(د) انعام اللہ خاں یقین کا تعارف ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

"انعام اللہ خاں یقین تخلص پسر اظہر الدین خاں، اولاد حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبیرۂ حضرت ایشاں (ایشاں) محمد معصوم عروۃ الوثقیٰ (عروۃ الوثقیٰ)، شاگرد مرزا مظہر جانجاناں، خوش خلق و خوش خوے، گرم جوش و یار باش، شگفتہ روئے، بوئے بہار گلستان سخن، عندلیب خوش نوائے چمن ایں فن، زبان گفتگوش گرہ کشائے زلف شام، و ہر مصرع نوشتہ اش بر صفحۂ کاغذ از کاکل بیاض خوش نما، طبع سخن پرداز او سرو مائل چمنستان اندازست گاہے در کوچہ باغ تلاش بطریق گلگشت قدم رنجہ می فرماید و در چمن بندی شعر خوش (لفظ، رنگیں چمن (چین)، نگیں خیال) ادا گل چینی دامن دامن شاعر زور در ریختہ در کمال علاقگی دارد، مطبع آشنائے درست، بندہ اکثر ملاقات کردم۔ خفیف اخلاص وی است ہمیشہ اتفاق باہم نشستن و فکر شعر کردن کہ در عہد عالم گیر بادشاہ باشد۔ مغفرت کند۔"

یہاں اس بات کی وضاحت چنداں ضروری نہیں کہ معنوی اعتبار سے یہ تعارف میر صاحب کے بیانات سے کس قدر مختلف ہے اور دونوں تحریروں میں کس حد تک تضاد پایا جاتا ہے لیکن اس تعارف کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس اقتباس میں "خوش خلق ... شگفتہ روئے" تک جن اوصاف کا ذکر آیا ہے نکات الشعرا میں وہ یقین کی بجائے مرزا رفیع سودا کی شخصیت سے منسوب ہیں اور ان اوراق میں بھی ان کے ترجمۂ احوال سے خارج نہیں کئے گئے ہیں، باقی عبارت کا بیشتر حصہ "بوئے بہار..... تا...... آشنائے درست" میر صاحب کے یہاں خواجہ میر درد سے متعلق ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان اوراق میں یقین سے قبل خواجہ صاحب کا تعارف بھی (میر صاحب کے بیانات کے دوسرے حصّوں کو حذف کرتے ہوئے) بعینہٖ انہیں الفاظ میں سپردِ قلم کیا جا چکا ہے اور "جوشِ بہار سے چمنستان اندازست" تک کے تمام جملے مرزا رفیع سودا کے ذکر میں بھی شامل ہیں۔

(ہ) نکات الشعرا میں (اور ان اوراق میں بھی) احسن اللہ احسن کی یہ شاعرانہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ "طبعش بسیار مائل بہ ایہام بود"۔ مرزا کاظم [illegible] لکھنوی نے اسی مفہوم کو قدرے وضاحت کے ساتھ اس طرح ادا کیا ہے کہ "در دیوانش شعرے یافتہ نشود کہ خالی از ایہام باشد، و دریں صنعت دستگاہ تمام داشت"۔ ہمارے علم کی حد تک وہ تنہا تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے احسن کے دیوان کا مطالعہ کیا ہے اور جن کے یہاں ان کے کلام کا سب سے مفصل اور جامع انتخاب ملتا ہے اس لئے ان کی اس رائے پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ بہرصورت ان اوراق میں احسن کے نام سے جو اشعار نقل کئے گئے ہیں، ان میں سے ایک تشبیہ اور زبان زد شعر (یہ مضمون غلط ہے احسن اللہ، کہ حسن خوب رویاں عارضی ہے) کے علاوہ کسی شعر میں اس صنعت کے التزام کا شائبہ تک نہیں گزرتا بطور مثال یہ غزل اس قسم کی تمام رعایتوں سے کلیتہً فرو ہے ؎

نہ خلوت نہ جلوت کے ہم یار ٹھہرے — فقط دیکھنے سے گنہگار ٹھہرے
وہ مشکل ہے راہِ محبت کہ جس میں — نہ کافر ہی ٹھہرے نہ دیندار ٹھہرے
نہ دیکھا کبھی دل کو آباد ہم نے — تم اس گھر میں جس دن سے مختار ٹھہرے
تسلی نہ ہوئی دل کو دیر و حرم میں — ترے در پہ ہم آکے ناچار ٹھہرے
صبا بوئے گل تو نے پہنچائی اب تو — ہمیں تیری آنکھوں میں اک خار ٹھہرے
جہاں تک کہ مقدور ہے دل لگی کا — ہم اور سب سے احسن سزاوار ٹھہرے

احسن کے رنگِ سخن سے واقفیت رکھنے والے اصحابِ ذوق یک نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ اشعار ان کی تصنیف نہیں ہو سکتے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ غزل ایک دوسرے شاعر مرزا احسن علی احسن لکھنوی کی تصنیف[4] ہے جو میر ضیا اور مرزا سودا کے شاگرد تھے اور بہ اعتبار زمانہ احسن اللہ احسن کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

(و) مندرجہ ذیل مطلع ان اوراق میں خان آرزو سے منسوب ہے ؎

از زلفِ سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے — در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

میر صاحب نے اسے خان آرزو کی بجائے مرزا معز فطرت کے نمونۂ کلام میں نقل کیا ہے۔ ہمارے نزدیک جہاں تک اس قسم کے معاملات کا تعلق ہے، آرزو سے قرابت قریبہ کی بنا پر ان کی دو تحریروں میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔

یکساں خیالات کی تکرار، ہم الفاظ عبارتوں اور جملوں کے اعادے، خلافِ واقعہ بیانات کی موجودگی، شاعر کے جانے پہچانے رنگِ سخن کی تمیز سے محرومی اور اشعار کے غلط انتساب کی ان مثالوں کے بعد بھی اگر بعض ناقابلِ انکار حقیقتوں

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

۱۔ نکات الشعرا طبع ثانی صفحہ ۹۰
۲۔ گلشن سخن شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) ص ۱۵
۳۔ "خوش معرکۂ زیبا" مولفہ سعادت خان ناصر لکھنوی مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ورق ۲۰ الف
۴۔ نکات الشعرا، طبع ثانی ص ۱۱

محمد علی کاظمی

قاضی عبدالغفار اور ان کا ابتدائی دورِ صحافت

مجھے قاضی صاحب کے ایک مضمون کا مسودہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مضمون بغیر کسی عنوان کے اور نامکمل صورت میں ہے۔ اس مضمون میں قاضی صاحب نے اخباری دنیا سے اپنی ابتدائی دلچسپی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"........ اسکول کا زمانہ تھا دسویں جماعت کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اس زمانے میں میرے گھر سے ملا ہوا نیر اعظم کا دفتر تھا مولوی احمد علی صاحب بانی اخبار کا انتقال ہو چکا تھا ان کے چھوٹے بھائی سید ابن علی صاحب اخبار چلا رہے تھے بڑے بھائی صاحب سے صرف آشنائی واقف تھا کہ صبح کو جب اسکول جاتا تھا تو ان کو اکثر چبوترہ پر ایک حقہ سامنے رکھے بیٹھے دیکھتا تھا۔ ایک پڑوسی کی حیثیت سے آشنا ہی جانتا تھا کہ یہ صاحب اخبار والے ہیں..... بڑے بھائی کے بعد جب سید ابن علی صاحب نے اخبار کو سنبھالا تو ان کے دفتر میں اکثر فرصت کے اوقات گزرنے لگے.........."

نیر اعظم اخبار جس کا ذکر قاضی صاحب نے اپنے اس مضمون میں کیا ہے اپنے وقت میں مراد آباد کا خاصا مشہور اور مقبول اخبار تھا اس زمانے کے اور اکثر بعد کے اخبار و رسائل میں نیر اعظم کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً رسالہ مرقع لکھنؤ نے اپنی فروری ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں نیر اعظم کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"........ یہ وہ قدیم اخبار ہے جس نے اپنی عمر کے پچاس سال بڑے لطف و خوبی اور شہرت و ناموری سے ختم کر کے اکیاونویں سال میں قدم بڑھایا ہے..... معیار کے اعتبار سے بھی قابل تعریف ہے......... ہمیشہ مسلمانوں کا ہمدرد اور ان کی ترقی و فلاح و بہبود کا خواہاں رہا........."

داستان تاریخ اردو میں حامد حسن قادری نے بھی اس دور کے چند دوسرے اہم اخبارات کے ساتھ نیر اعظم کا ذکر کیا ہے انھوں ... ہے کہ

"....... البشیر اٹاوہ، نیر اعظم مراد آباد، ہندوستانی لکھنؤ، دبدبہ دکن .... وغیرہ اپنے دور اور اپنے زمانے کے رنگ میں نہایت پختہ تھے۔ ان سب نے زبان کی خدمت اور ملک کی تیاری زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے بہتر سے بہتر کی.... ....."[1]

پرانے اخبار و رسائل کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ شہر مراد آباد اخباری لحاظ سے کافی زرخیز رہا ہے۔ نیر اعظم کا ایک دوسرا اہم عصر اخبار "نجم عالم" بھی تھا۔ یہ بھی اپنے وقت اور اپنے حلقے کا خاصا مقبول اور معروف اخبار تھا۔ اس کے علاوہ بھی مراد آباد کی سرزمین سے برابر اخبار نکلتے رہے ہیں جن میں منفعت، مکہ مدینہ، دبدبہ، مسافر، جدت، جوہر خاصے پرانے اور اپنے حلقے میں خاصے مقبول پرچے تھے۔

ان اخبارات کے ذکر سے ہمارا مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ مراد آباد کے بیشتر حضرات کو اخباری دنیا سے تنی طور پر دلچسپی رہی ہے اور صحافت کا ذوق و شوق اور اس کا چرچا وہاں کے ماحول میں کافی رہا ہے۔ قاضی عبدالغفار نے بھی اس ماحول میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی تھی۔ خود قاضی صاحب کے بقول انھیں بچپن ہی سے اپنے پڑوسی ابن علی صاحب کے توسل سے اخباری دنیا سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ قاضی صاحب اپنے متذکرہ بالا مضمون میں اپنے اس زمانے کے بارے میں مزید لکھتے ہیں۔

"......... اسکول سے واپس آ کر میں .... دو تین گھنٹے روزانہ مولوی صاحب کے دفتر میں بیٹھا کرتا تھا علاوہ خطوط، ایڈیٹوریل اور نوٹس لکھنے اور کاپی کی محنت کرنے کے کبھی کبھی بچے کی چٹھیاں بھی لکھنی ہوتی تھیں میرے لیے اس زمانے میں اخبار نویسی بہت دلچسپ چیز تھی اور مضمون نویسی کے جراثیم میرے اندر پیدا ہو چلے تھے......"

---

[1] داستان تاریخ اردو۔ از حامد حسن قادری۔ ص ۶۵۹۔ دوسرا اڈیشن ۱۹۵۰ء

شہریار

غزل

یہ اک شجر کہ جس پہ نہ کانٹا نہ پھول ہے
سائے میں اس کے بیٹھ کے رونا فضول ہے

راتوں سے روشنی کی طلب ہائے سادگی
خوابوں میں اس کی دید کی خواہش بھول ہے

ہے ان کے دم قدم ہی سے قائم بہارِ زیست
دامن میں جن کے دشتِ تمنا کی دھول ہے

سورج کا قہر صرف ہمیشہ سروں پہ ہے
پوچھو ہوس پرست سے وہ کیوں ملول ہے!

آؤ ہوا کے ہاتھ کی تلوار چوم لیں
اب بزدلوں کی فوج سے لڑنا فضول ہے

خود قاضی صاحب کی اس تحریر کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ "نیّرِ اعظم" اخبار کا پڑوس، اس کے ایڈیٹر ابن علی صاحب سے قاضی صاحب کی دوستی اور قاضی صاحب کا ایڈیٹر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا قاضی صاحب کا اخباری دنیا سے تعارف کی طرف پہلا قدم تھا۔ اور یہیں سے انھیں اخباری دنیا سے دلچسپی ہوئی۔ اور ان کی مضمون نگاری کی داغ بیل پڑی۔ اب یہ حسنِ اتفاق ہے کہ قاضی صاحب کی اس اتفاقیہ دلچسپی کو آگے چل کر ایک وسیع تر میدان مل گیا۔ اور آئندہ زندگی میں ان کی یہ ابتدائی اور اتفاقیہ دلچسپی ہی ان کی زندگی کا ایک اہم مقصد اور ان کے لیے وجہ امتیاز بن گئی۔

سماجی اور سیاسی ہر دو لحاظ سے قاضی صاحب کی عہدِ طفلی اور اس کے بعد کا زمانہ خاصا نشیب و فراز کا زمانہ تھا۔ ایک نوجوان، حساس اور بیدار مغز ذہن کے لیے یہ دور اپنے میں خاصی دلچسپی اور دردمندی کا سامان رکھتا تھا۔ مراد آباد سے ہائی اسکول کرنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں قاضی صاحب مزید تعلیم کی غرض سے علی گڑھ چلے آئے تھے لیکن ایف اے میں دو سال متواتر فیل ہونے کی بنا پر ان کے والد قاضی ابرار احمد نے انھیں علی گڑھ سے واپس بلا لیا۔ اور کوشش کر کے محکمہ جنگلات میں انھیں سرکاری نوکری دلا دی۔ ۱۹۰۸ء میں قاضی صاحب نے علی گڑھ چھوڑا۔ اور اسی سال ملازمت کے بکھیڑے میں پڑ گئے۔

۱۹۱۲ء میں علی برادران کو کچھ ایسے لوگوں کی تلاش ہوئی جو کامریڈ اخبار کے کلکتے سے دہلی منتقل ہونے پر اور ان کے نئے نکلنے والے اخبار "ہمدرد" میں ان کا ہاتھ بٹا سکیں۔ اس تلاش و جستجو میں علی برادران میر محفوظ علی بدایونی کے علاوہ دوسرے حضرات سے بھی [illegible] اور لوگوں کا تعاون حاصل کر سکیں۔ میر محفوظ علی بدایونی کی تحریک پر قاضی صاحب کا نام بھی زیر بحث آیا۔ اور آخر کار انھیں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دلا کر دلی لایا گیا۔ جہاں علی برادران کے اخبارات "کامریڈ" اور "ہمدرد" کے سایہ میں باقاعدہ قاضی صاحب کے صحافیانہ شعور کو پنپنے کا موقع ملا۔

علی برادران کی صحبتوں کے ساتھ ساتھ انھیں حضرات کے توسل سے قاضی صاحب کو حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری جیسے اکابرانِ وقت سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی یہ وہ حضرات تھے جن کی صحافت اور جن کے خیالات کا اثر بقول آل احمد سرور ملک کی صحافتی زندگی ہی پر نہیں بلکہ اس کی ذہنی زندگی پر بھی پڑا۔[1]

مولانا محمد علی سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر قاضی صاحب نے [illegible] ایک نشری تقریر میں ان الفاظ میں کیا تھا۔

"........ موسم سرما اور وہ بھی دلی کا موسم سرما، اور [illegible] صبح پانچ بجے شوکت بھائی چند ماہ پہلے مجھے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دلا کر یہاں لے آئے تھے۔ اب دسمبر ۱۹۱۲ء [illegible] اس صبح کو (۱۰ بجے) کلکتے کی سکونت ترک کر کے محمد علی [illegible] دلی آرہے تھے۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ اور میں چیلوں کے کوچے سے بھاگم بھاگ چاندنی چوک تک پہنچا۔ اس وقت کوئی تانگہ میسر نہ آیا۔ اس لیے پیدل ہی اسٹیشن تک کا فاصلہ بھاگتے بھاگتے طے کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میری عمر (۲۲) سال سے زیادہ نہ تھی ...... کا فرزند رشید محمد علی سے اس قدر قریب آنے کا شوق میری جوانی کو بیتاب کر رہا تھا۔ اور دہلی ریلوے اسٹیشن کے اس پلیٹ فارم پر دسمبر کی وہ صبح میری زندگی کا نیا باب شروع کر رہی تھی ......"[2]

اور جب ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو "ہمدرد" "نقیبِ ہمدرد" کے نام سے جاری ہوا تو [illegible]

"...... میر محفوظ علی منیجر تھے، سید ہاشمی فرید آبادی، قاضی عبدالغفار، سید جالب دہلوی، مولوی عبدالحلیم شرر، فاروقی صاحب دیوانہ بھی ہمدرد کے دفتر میں موجود تھے ......"[3]

اس طرح قاضی صاحب کے صحافیانہ شعور کی پرورش اور نشوونما ایک ایسے تجربہ کار شخص کی صحبت اور رہنمائی میں ہوئی جس کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"........ سیاسی واقفیت اور تربیت محمد علی کے ساتھ رہ کر جتنی حاصل ہو جاتی تھی وہ بجائے خود ایک نعمت تھی اور واقفیت صرف سیاسیاتِ ہند ہی سے نہیں بلکہ سیاسیاتِ عالم سے بھی ......"[4]

اس زمانے میں مولانا محمد علی کی صحبتوں سے فیضان کا ذکر اور اس کا اعتراف خود قاضی صاحب نے بھی کیا ہے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں علی برادران کی رہائی کے موقع پر قاضی صاحب نے "پانچ سال بعد" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انھوں نے اس زمانے کی [illegible] کی صحبتوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"........ میری زندگی میں وہ ایک یادگار صبح تھی، یعنی وہ پہلا دن تھا جب بحیثیت استاد و شاگرد میرے اور محمد علی صاحب کے مستقل تعلقات شروع ہوئے ...... میں اس زمانے کو نہیں بھول سکتا جب ہمدرد و کامریڈ کے دفتر میں صبح و شام تمام ممبران اسٹاف اخبار کے مشورہ میں شریک ہوتے تھے۔ شوکت علی، محمد علی، سید محفوظ علی، راجہ غلام حسین مرحوم اور میں، اور دو چار اور ہم سب زیر بحث مسائل پر گفتگو کرتے تھے ......"[5]

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

---

[1] ادب و نظریہ ص [illegible] آل احمد سرور

[2] مشاہیر ہند "مولانا محمد علی" تقریر قاضی عبدالغفار۔ بحوالہ اخبار حریت، مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۳ء

[3] سیرت محمد علی۔ مرتبہ رئیس احمد جعفری

[4] محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ از عبدالماجد دریابادی

[5] پانچ سال بعد۔ قاضی عبدالغفار۔ نقیب ہمدرد [illegible] بحوالہ حریت کراچی، ۱۰ دسمبر ۱۹۷۳ء

مراسلات

"ہماری زبان" میں حصۂ نظم

"ہماری زبان" میں نئی تبدیلیاں خوشگوار ہیں۔ لیکن ایک کمی مجھے ہی نہیں اکثر اہلِ ذوق کو گراں گزر رہی ہے اور وہ ہے حصۂ نظم کا برائے نام رہ جانا۔ ویسے ہی ہماری زبان میں ایک ہی صفحہ تو حصۂ نظم کے لیے وقف تھا!

(۱) کیا حصۂ نظم نثر سے کم اہمیت رکھتا ہے؟

(۲) کیا کوئی اہلِ ذوق حصۂ نظم کی افادیت سے منحرف ہو سکتا ہے؟

(۳) کیا حصۂ نظم ناظرین "ہماری زبان" کی طبعِ نازک پر گراں گزرتا ہے؟

اگر ایسا ہے تو پھر ایک نظم اور ایک غزل کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ ورنہ ایک صفحہ تو کم از کم حصۂ نظم کے لیے وقف ہونا ہی چاہیے۔ کیا ناظرین "ہماری زبان" میرے خیال کی تائید فرمائیں گے؟ (میر عرفانی سرونجی)

انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات کے بارے میں

(۱)

"انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات" کے سلسلے میں درجِ ذیل خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

اردو زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ کے مترادفات کے تعین سے پہلے ضروری ہے کہ یہ بات خاطر نشان کر لی جائے کہ اصلاً لفظ کی فطرت میں اپنے معنی سے متعلق کوئی اشارہ پوشیدہ نہیں ہوتا۔ لیکن ایک بار وضع ہونے کے بعد (یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ الفاظ کیسے وضع کر لیے جاتے ہیں یا وضع ہو جاتے ہیں) اس کا استعمال معنی کا تعین کرتا ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہر لفظ اپنے پیچھے روایت اور رواج کی پوری تاریخ رکھتا ہے۔ روایت کی یہ قوت ہی ہر لفظ کو یہ اثر بخشتی ہے کہ اس کے سننے کے ساتھ ہی ہمارے ذہن میں ایک خاص معنوی پیکر ابھر آتا ہے۔ پھر اپنے حقیقی (لغوی) معنی کے علاوہ لفظ کے مجازی استعمال سے اس کے اور اور معنی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسی سے لفظ کے معانی میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔

یہ بات بھی مسلم ہے کہ انسانی خیال ماحول کے تابع ہوتا ہے اور اس خیال کو ظاہر کرنے کے لیے ہی الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے کسی بھی زبان میں صرف وہی لفظ پائے جاتے ہیں جو اس کے مخصوص معاشرہ کے تقاضوں اور اس کے رسم و رواج کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہوں اور اسی لیے ضروری نہیں کہ ہر زبان میں دوسری زبانوں کے مترادفات بعینہٖ مل جائیں۔ جب کبھی ایسی ضرورت درپیش آتی ہے تو یہی دونوں مسلمات کارفرما ہوتے ہیں۔ شروع میں شاید کوئی لفظ معنی کی وہ کیفیت پیدا نہ کر سکے مگر جب اسی خاص معنی میں اس کا رواج ہوتا ہے تو لفظ و معنی میں خود بخود یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دوسری زبانوں سے ترجمہ کرتے وقت ہی ہمیں اس طرح کی پریشانی ہوتی ہے۔ ورنہ خود اپنی زبان پر نظر ڈالیے تو معانی کا ایک جہان نظر آتا ہے اور یہ سوال پیدا بھی نہیں ہوتا کہ کوئی لفظ کیوں اور کیسے ایک خاص معنی کا حامل ہے۔ مثال کے لیے ایک معمولی لفظ "نقل" لیجیے۔ اس کے متعدد معانی ہیں۔

(۱) ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا (۲) نمونہ اتارنا (۳) محو شدہ (۴) لطیفہ (۵) کہانی (۶) سوانگ (۷)، کل استعمال ہی ان مختلف معانی میں سے کسی ایک کا تعین کرتا ہے۔ پھر اس کے مشتقات کے ساتھ جو خاص معنی وابستہ ہو گئے ہیں ان میں سے صرف دو پر نظر ڈالیے۔

نقال: لغوی معنی "نمونہ یا نقل اتارنے والا" ہوں گے۔ لیکن اب ہر نمونہ اتارنے والے کو نقال نہیں کہتے۔

انتقال: لغوی معنی صرف "جگہ بدلنا" یا "ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا" لیکن اب ہر جگہ کی تبدیلی کو انتقال نہیں کہا جاتا۔

"نقل" عربی اصل لفظ ہے۔ لیکن عربی میں اس کے یہ دونوں مشتقات ان مخصوص معانی کے ساتھ نہیں ہیں۔ اردو نے ان کو یہ معنی دئے۔ شروع میں معنی کی یہ تخصیص نہیں ہوگی۔ لیکن نے ان کے معنی متعین کرنے میں مدد دی اور رواجِ عام نے ان پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

اس عرض داشت کا مطلب صرف یہ کہ ان الفاظ کے ترجمہ میں مکھی پر مکھی مارنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک مخصوص معنی میں جب لفظ کا چلن ہوگا تو کچھ عرصہ میں اس کے یہ معنی متعین ہو جائیں گے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ الفاظ مانوس اور زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔

RESURRECTION کا مفہوم ایک لفظ میں "رجعت" سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ مادہ فعل "رجع" (لوٹنا، واپس آنا) کے کئی مشتقات اردو میں عام ہیں۔

رجوع، راجع، مرجع، رجعت، مراجعت، وغیرہ

ایک اور لفظ "ترجیع" بھی ہے جو اردو میں مفرد طور پر تو نہیں، لیکن ایک دو مرکبات میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے رجعت یا مراجعت میں سے کوئی ایک لفظ اس مفہوم کے لیے باسانی استعمال ہو سکتا ہے۔ ان میں RE سابقہ کا مفہوم بھی شامل ہے اور اس واقع کی تلمیح بننے کی پوری صلاحیت۔ ان میں سے منتخب لفظ کے معنی میں ایک اور پہلو کا اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن ان میں سے "رجعت" اس لیے بہتر ہوگا کہ مراجعت عام واپسی کے معنی میں ہمارے ہاں مستعمل ہے۔ زیادہ وضاحت کی ضرورت بھی جائے تو "رجعت عیسیٰ" یا "رجعت مسیح" کہا جا سکتا ہے۔

یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ اس سلسلے میں جن حضرات نے اپنی رائے کا اظہار کیا سب نے انگریزی۔ اردو لغات کے حوالے دئے جن میں سے کوئی بھی مناسب اور قابلِ اطمینان لفظ نہیں نکل سکا۔ پلیٹس کی اردو انگریزی لغت نے بھی اس سلسلے میں رہنمائی کی ہے رجعت کے ذیل میں RESURRECTION بھی موجود ہے۔ اسے بھی سند مانا جا سکتا ہے۔ (عتیق احمد صدیقی)

(۲)

جناب م۔ ن۔ سعید صاحب کا استفسار "ان انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات کیا ہیں" پر بہت سے اہلِ قلم حضرات نے رائیں دی ہیں۔

اس کے بارے میں میری ناچیز رائے یہ ہے کہ RESURRECTION کا

رواج ہماری زبان میں قریب قریب نہیں کے ہے۔ ان ترجموں میں نشاۃ الثانیہ کہئے یا جی چاہے۔ آجکل زبان کو سادہ بنانے کے لیے ثقیل الفاظ سے پرہیز زیادہ اچھا ہے۔ نشاۃ الثانیہ اچھا ہے لیکن جب دوسروں کو بھی اچھا لگے۔

۲۔ ہوم سِک HOME SICK کو پڑھا لکھا طبقہ اپنی زبان میں ہوم سِک ہی بولتا ہے اس کو ہوم سِک ہی بولنا مناسب ہے کیونکہ صحیح مفہوم دوسرے طریقے سے ادا کرنا دشوار ہے۔

۳۔ بس مین کا استعمال ہماری زبان میں عام ہے اس کو پُر تکلف بنانے سے کیا فائدہ اس کے مفہوم سے ہر شخص واقف ہے۔

جب ہماری زبان میں اس کی صلاحیت موجود ہے کہ ہم دوسری زبان کے الفاظ بالکل اسی نفاست کے ساتھ لے لیں اور بولیں تو پھر ہم کو اس قسم کے ترجموں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مثلاً اسٹیشن۔ بنگ۔ ریسٹورنٹ۔ نل۔ بنیا۔ سنیما۔ کونسل ہاؤس۔ بُش شرٹ۔ جیکٹ وغیرہ وغیرہ اس لیے میں تو یہی کہوں گا کہ ایسے جتنے لفظ بھی جب ضرورت آتے جائیں وہ سب ہم کو بے خدشہ لے لینا چاہئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال رہے کہ زبان میں ثقل نہ پیدا ہو۔

(طاہر محسن علوی)

محسن الملک کی کتابیں

مجھے نواب محسن الملک کی تین کتابیں (۱) میلاد نامہ (۲) کتاب المحبت والشوق (۳) تفسیر سورہ محل بالحدیث مطلوب ہیں۔ اگر قیمتاً کوئی صاحب دے سکیں تو میں خرید لوں گا اگر عاریتاً بھیج سکیں تو نقل کرکے واپس کر دوں گا۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

۱۸۔ رام گلی نمبر ۳۔ لاہور (مغربی پاکستان)

صفحہ ۹ سے آگے

کے باعث ان اوراق کو نکات الشعرا کا ایک جز قرار دیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میر صاحب حد درجہ ذہنی افلاس اور شعوری کم مائیگی کا شکار تھے۔ ان کی معلومات کا سرمایہ بہت ہی محدود اور کم اور تھا اور انھیں اظہار مافی الضمیر پر دسترس حاصل نہ تھی جس کی ان جیسے ممتاز اور معروف صاحب قلم سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے۔ چونکہ یہ تمام باتیں کسی وجہ سے بھی قابل قبول نہیں اس لیے ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ اوراق میر صاحب کی بجائے کسی ایسے کم نظر اور ناپختہ کار مصنف کی کوششوں کا نتیجہ ہیں جس نے اشعار کی جمع و تدوین سے اپنی دلچسپی کو عملی شکل دینے کے لیے میر صاحب کے بیانات کی قطع و برید پر اکتفا کیا ہے اور اس کی علت فکر نہیں کی ہے کہ یہ سرقہ اہل نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکے گا۔ تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اس قسم کی دست درازیوں کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔[۱]

---

[۱] جیسے شمالی ہند کی اردو گو تذکرہ کے بیاض حسنی مرتبہ ۹۹۹ھ و ۱۲۵۰ھ اکا تقریباً نصف حصہ تذکرہ ریختہ گویاں موسومہ مولفہ علی گردیزی اور تاریخ تکمیل ۱۱۶۶ھ (مرتبہ مولوی ۱۹۳۳ء) سے ماخوذ منقول ہے یہی طرح نقش بند سوانح حیات مشہور مسالک ابیات مقبول حیدر آباد ۱۹۳۴ء ۱۱۸۸ھ لیکن در اصل نمبر ان ۱۹۳۴ء اور حقیقت گلزار ابراہیم (سال تکمیل ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء) کا محض اردو ترجمہ ہے۔

انیس انور

مکتوب لندن

برطانیہ میں اردو داں

۱۹۶۶ء کی برطانوی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں اردو داں طبقہ کی تعداد تقریباً پونے ۳ لاکھ ہے۔ ان میں بھارتی تارکین وطن کی تعداد ۲ لاکھ ۴۲ ہزار دو سو دس ہے۔ پاکستانی تارکین وطن ۲۴ ہزار ۱۳۰ ہیں اور کینیا سے آئے ہوئے ہندوستانی و پاکستانی افراد کی تعداد ۱۰ ہزار سے کچھ زائد ہے۔ ان اردو داں ایشیائی باشندوں کے علاوہ وہ تمام انگریز بھی اردو سے واقف ہیں، جو گذشتہ دو سو سال سے برصغیر میں بسلسلۂ حکومت، تجارت اور ملازمت مشغول رہے ہیں اور جنھوں نے اردو زبان سیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان انگریزوں کی تعداد میں بیسیوں انگریز طلبہ کا بھی اضافہ کر دیجئے جنھیں گذشتہ سال میں نے اردو پڑھائی ہے اور اس سلسلہ میں مشرق میں شائع شدہ ایک خط کا اقتباس بھی ایک نیا پہلو لئے ہوئے ہے۔

میں نے شادی کے بعد اردو زبان سیکھی

میرا نام سیما ہے میری پیدائش سکاٹ لینڈ میں ہوئی۔ میرے شوہر پاکستانی سول انجینئر ہیں۔ میری ایک ننھی سی بچی بھی ہے۔ زہرہ نام ہے۔ ڈیڑھ سال کی عمر ہے۔ شادی کے کچھ دن بعد میں نے اسلام قبول کیا تھا مجھے اپنے مذہب پر فخر ہے، میں ان دنوں اپنے شوہر کے ساتھ ویلکس ڈرائیو، ایرڈ گیفٹ میں رہتی ہوں اور مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ شادی کے بعد میں نے اردو بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھا اور یہ خط میں آپ کو خود لکھ رہی ہوں۔“ اس خط کے ساتھ ”مشرق“ نے مسز سیما نعیم کی دستخط شدہ تصویر بھی شائع کی ہے۔

بزم تفریح لندن کا بیس سالہ جشن

بزم تفریح لندن کا بیس سالہ جشن ۱۹ مارچ بروز ہفتہ الا مینس ہال پالمراسٹریٹ میں منایا جا رہا ہے۔ بزم کے جنرل سکریٹری عبدالعلیم صدیقی نے اس تقریب میں پاکستان اور بھارت کے ہائی کمشنروں کی شرکت کی توقع ظاہر کی ہے حسب دستور اس محفل میں بھی مشاعرہ و موسیقی کا اعلیٰ اہتمام کیا گیا ہے۔

شعبۂ اردو پٹنہ یونی ورسٹی میں مجلس مذاکرہ

پٹنہ ۹ رمارچ۔ گذشتہ دنوں شعبۂ اردو پٹنہ یونی ورسٹی میں "اردو شاعری میں نئے تجربات" کے عنوان سے ایک سمپوزیم ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر اختر اورینوی نے کی۔ مذاکرہ میں حصہ لینے والوں میں مخدوم محی الدین، اختر اورینوی، نیاز حیدر اور اسلم آزاد کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ یہ مذاکرہ تقریباً تین گھنٹے تک چلتا رہا۔ مخدوم نے اپنی گفتگو میں کہا کہ نئی شاعری خاص نہج اور خاص مقصد کے تحت کی جارہی ہے۔ یہ تحریک نئی نسل سے اس کی امنگیں، تمنائیں اور آرزوئیں چھین لینا چاہتی ہے۔ یہ رجحان بہت ہی مہلک اور خطرناک ہے نئے شعراء کی یہ دلیل کہ حالات بدل گئے ہیں۔ یہ سائنس اور ٹیکنولوجی کا عہد ہے۔ انسان زہرہ اور ثریا پر کمندیں پھینک رہا ہے۔ لیکن یہ حالات مغرب میں ہیں مغربی ممالک جیسے حالات و عوامل ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں نہیں جہاں کی ۸۰ فیصد آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ پھر ہم اپنی ذات کے خول میں کیوں کر بند ہو جائیں۔ انھوں نے نئے شعراء پر اعتراض کیا کہ ان کی شاعری کا کوئی مقصد نہیں کوئی منزل نہیں۔ بغیر تعین مقصد کے اعلیٰ شاعری ممکن نہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے نئی شاعری کی بعض خامیوں کی جانب توجہ دلائی اور کہا کہ نئے شعراء تنہائی، خودکشی، انگریزی اور جنس کو ہی محور شاعری بنائے ہوئے ہیں۔ جبکہ دور حاضر میں موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ انھیں نے تسلیم کیا کہ نئے شعراء میں اچھے اور باصلاحیت فنکار ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اکثریت آنکھ بند کر مغرب کی تقلید کر رہی ہے۔ ان شعراء نے جدید مغربی شاعری کا مطالعہ تک نہیں کیا ہے۔ لیکن وہ متاثر ضرور ہیں۔ ہم اپنی افسردگی، مایوسی اور نامرادی کے احساسات اور اثرات کو دوسروں پر کیسے منطبق کر سکتے ہیں؟ پھر جو شاعری خودکشی اور جنسی بے راہ روی کی ترغیب و تحریص دے ایسی شاعری کو ہم اعلیٰ اور ارفع کیونکر کہہ سکتے ہیں! شاعری کے کچھ اصول اور ضوابط ہیں۔ اس کے لیے ترتیب، تنظیم اور تزئین ناگزیر ہے۔ نیاز حیدر نے نئی شاعری میں ترسیل اور ابلاغ کے فقدان کا شکوہ کیا اور کہا کہ یہ شاعری بالکل مبہم اور ناقابل افہام ہے انھوں نے بتایا کہ نئی نسل خصوصاً طلبہ گمراہ ہو رہے ہیں۔ ان کے ذہن کو مفلوج اور ماؤف کیا جارہا ہے اور دلوں کو بنجر۔ اسلم آزاد نے نئی شاعری کی حمایت میں کہا کہ ابہام اور پیچیدگی دراصل قاری کے ذہنوں میں ہوتی ہے۔ یہ شاعری ذاتی اور حسی تجربات و مشاہدات سے عبارت ہے۔ ہم نئی شاعری کو سمجھنا نہیں چاہتے۔ غالب اور اقبال کو ان کے عہد میں بہت کم لوگوں نے سمجھا۔ لیکن ہم انھیں سمجھ رہے ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے کہ آئندہ نسل نئی شاعری کو سمجھے اور اس سے مستفید ہو۔

شرکا میں علامہ جمیل مظہری، رضا نقوی واہی، ڈاکٹر مطیع الرحمن، پروفیسر سید حسن، پروفیسر بدر الحسن، رخسانہ خاتون، نشاط آرا اور رفعت جہاں وغیرہم کے نام قابل ذکر ہیں۔ شکریہ کے ساتھ اس علمی اور ادبی مذاکرہ کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔ (نامہ نگار)

بریلی میں یوم غالب کا پروگرام

ساہتیہ کلا اکاڈمی بریلی نے تقریبات یوم غالب منانے کے لیے جناب پی۔سی۔ آزاد، ایم۔ ایل۔ سی، جناب وسیم بریلوی، جناب انور چغتائی، جناب محمد حسین سابق ایم۔ ایل۔ اے اور جناب شمسی بریلوی پر مشتمل انتظامیہ کمیٹی کے زیر اہتمام ۸ر اپریل ڈسٹرکٹ بورڈ ہال بریلی مندرجہ ذیل پروگرام کو عمل میں لانا طے کیا ہے۔ اس کمیٹی کے کنوینر جناب پی۔سی۔ آزاد ہیں یہ تقریبات دو اجلاس نشستوں پر مشتمل ہوں گی جس میں پہلی نشست بزم تقاریر و مقالات اور دوسری نشست بزم شعر و سخن ہوگی۔ بزم تقاریر کا افتتاح جناب نسیم قریشی، شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ فرمائیں گے موضوع تقریر غالب کی شاعرانہ عظمت ہوگا۔ دوسرے مقررین حکیم عبد الوحید صاحب بریلوی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ریڈر شعبۂ اردو، دلی یونی ورسٹی دلی ہوں گے۔ بزم مقالات میں ڈاکٹر محمد حسن ریڈر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، شعبۂ اردو لکھنؤ یونی ورسٹی، جناب عابد سہیل رکن ادارہ نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ، جناب منظر سلیم رکن ادارہ قومی آواز لکھنؤ اور جناب وسیم بریلوی شعبۂ اردو بریلی کالج بریلی شرکت فرمائیں گے۔ بزم شعر و سخن میں دس مقامی شاعروں شعراء کے علاوہ ڈاکٹر حسین احسن جذبی، جناب غلام ربانی تاباں، جناب نشور واحدی، جناب ناز ش پرتاب گڑھی، جناب دشنو کمار شوق لکھنوی، جناب منظر سلیم، جناب قمر مرادآبادی وغیرہ کی شرکت متوقع ہے۔ شعرائے کرام غالب کی زمینوں میں غزلیں پڑھیں گے۔ (نامہ نگار)

بہار میں جشن غالب کی تیاری

آرہ۔ حال ہی جناب ڈاکٹر شمیم احمد صاحب کے دولت کدے پر ایک مشاورتی جلسہ جناب پروفیسر ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب کی صدارت میں بہار میں غالب کی صد سالہ تقریب منانے کے سلسلے میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب حلقۂ احباب آرہ کے زیر اہتمام منائی گئی غالب کی ناٹویں برسی کی تقریب کے افتتاح کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے یہ مشاورتی جلسہ موصوف ہی کے ایما پر منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل حضرات کی شرکت قابل ذکر ہے۔ جناب ڈاکٹر شمیم احمد، جناب حفیظ بناری، جناب انیس امام جناب ظہور رضوی برق، جناب حلیم اللہ حالی، جناب نسیم محمد جان، جناب ناصر زیدی، جناب ابوالظفر، جناب جے چندر پرساد جین اور جناب عبد اللطیف (آرٹسٹ)

ابتدا میں جناب انیس امام صاحب نے جلسہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب کے مفید مشوروں سے استفادے کا شکریہ ادا کیا۔

جناب صدر نے عالمی پیمانے پر منائی جانے والی غالب کی صد سالہ تقریب کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے اپنی اس شدید خواہش کا اظہار کیا

کہ جشن غالب ریاست بہار میں بھی پورے زور و شور سے منایا جانا چاہئے موصوف نے فرمایا کہ اس مشاورتی جلسے کا کام صرف یہ ہوگا کہ ایک اجمالی خاکہ تیار کرکے بہار سے نکلنے والے اور بہار میں زیادہ سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو روزناموں اور ہفتہ واروں کو اشاعت کے لیے بھیج دیا جائے۔ اس کے بعد یہ غالب نوازوں کا کام ہوگا کہ اس تقریب کو کس پیمانے پر منائیں۔ موصوف نے آرہ کی ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا اور جناب سید حسن ناصر نائب صدر حلقہ احباب آرہ نیز دیگر حاضرین شہر اور ادیبوں کو مبارکباد پیش کی جنھوں نے غالب کی صد سالہ تقریب کا گویا آغاز کر دیا ہے۔ کافی غور و خوض کے بعد یہ جلسہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جشن غالب دو سطحوں پر منایا جا سکتا ہے۔ ایک یونیورسٹی سطح پر اور دوسرے عوامی سطح پر۔ ہر یونیورسٹی ایک اپنا یونٹ قائم کرے یا پھر مختلف کالجوں میں الگ یونٹ ہوں۔ بہتر یہ ہوگا کہ ایک شہر کے کئی کالج مل کر ایک یونٹ قائم کریں (یہ صورت چھوٹے شہروں کے لیے زیادہ مناسب ہوگی) اس طرح مختلف شہروں میں مختلف یونٹ قائم ہو جائیں گے۔ ان کی تقریبوں میں تاریخ اور وقت کا تصادم بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ البتہ ایک ہی شہر میں اس طرح کے تصادم سے بچنا مستحسن ہوگا۔ جامعات کے لیے یہ مستحسن ہوگا کہ وہ تعمیری پروگراموں پر اپنی توجہ مرکوز کریں مثلاً غالب پر مضمون لکھے اور لکھوائے جائیں۔ غالب نمائش کا اہتمام کیا جائے۔ غالب پر فیچر اور ڈرامے لکھے جائیں۔ مثلاً غالب کے خطوط کی بنیاد پر کوئی فیچر ہو۔ غالب سے جدید شعراء کا انٹرویو (جوابات غالب اشعار غالب میں)۔ مضامین کے لیے بہت سے ممکن عنوانات ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بہار میں غالب۔ غالب کے بہاری تلامذہ۔ خطوں میں غالب۔ غالب اپنے قصیدوں کے آئینے میں۔ غالب کے خطوط میں ان کی شخصیت کی تلاش۔ غالب کی فارسی شاعری۔ غالب کا سفر کلکتہ۔ غالب ہندی والوں کی نظر میں (خاص ہندی والوں کے لیے) غالب کی حیات معاشقہ۔ غالب کی رفیقۂ حیات۔ غالب کرایے کے مکانوں میں (طنزیہ و مزاحیہ)۔ غالب شراب اور شاعری۔ ذوق و غالب کی چشمکیں۔ غالب کا تصور حیات۔ غالب کا سیاسی شعور۔ مغل بچہ (مزاحیہ) وغیرہ۔ عوامی سطح پر تفریحی پروگرام بھی پیش کئے جا سکتے ہیں مثلاً ردیفوں کا مشاعرہ۔ مرزا غالب کی نمائش۔ کنھیا لال کپور کا فیچر "غالب جدید شعراء کی محفل میں" کو اسٹیج کرنا۔ غالب کی طرحوں میں مشاعرے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے پروگرام مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ یہ پروگرام پورے سال پر محیط ہوں۔ آخری منزل پہ غالب ہفتہ منایا جائے جس میں غالب نمائش کا اہتمام کیا جائے اور "غالب نامہ" کا اجرا ہو۔ آخر میں جلسہ نے مندرجہ ذیل تجویز پاس کی۔ یہ مشاورتی جلسہ ریاست بہار کی تمام اردو انجمنوں ادبی اداروں یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں ادیبوں اور ادب نوازوں سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ وہ غالب کی صد سالہ تقریب ریاست بہار کی شاندار روایتوں کے پس منظر میں منانے کی کوشش کریں۔

(انیس امام)

غازیپور گورنمنٹ سٹی انٹر کالج سے اردو کے

خاتمہ کا اندیشہ

غازی پور ۔۔ یہاں کے گورنمنٹ سٹی انٹر کالج کی طرف سے گورنمنٹ کو لکھ دیا گیا ہے کہ کالج کے لیے اردو کا استاد نہیں چاہیے۔ کیونکہ اردو لینے والے طلبہ کی تعداد بہت کم ہے اس لیے کالج کے اردو جاننے والے بعض استادوں سے یہ کام لیا جائے گا۔ حالانکہ تقریباً ہر درجے میں اب بھی اردو کے لیے طلبہ موجود ہیں اور اردو کے ایک استاد کے لیے وافر کام موجود ہے۔ بجا طور پر اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اقدام سے اردو کو سرے سے ختم کرنا مقصود ہے۔ طلبہ کی کمی محض اس وجہ سے ہے کہ جولائی میں داخلہ کے وقت کالج میں کوئی اسکول ٹیچر نہیں تھا۔ اس لیے اردو والے بڑی تعداد میں داخل نہیں ہوئے اگر اردو ٹیچر کا انتظام ہوگا تو آئندہ سال کافی اردو خواں طلبہ داخلہ لیں گے۔ (ریاست)

مشاعرہ بیادِ غالب

حیدر آباد ۱۰ر مارچ خانوادۂ آصفی کے ممتاز فرد پرنس لطیف علی خاں بہادر ثاقب کی کوٹھی "زرنشاں" میں غالب صد سالہ تقاریب کے سلسلے میں شہری طرحی محفل شعر منعقد ہوئی۔ حضور نظام مرحوم کے صاحبزادے پرنس نقی جاہ بہادر نے صدارت فرمائی۔ حیدر آباد کے ممتاز قدیم و جدید مکتب خیال کے شعراء ڈاکٹر طاہر علی خاں حکم، حضرت حیرت بدایونی، حضرت تاج قریشی، پرنس سعادت جاہ، پرنس لطیف علی خاں ثاقب، کنول پرشاد کنول، ڈاکٹر غیاث صدیقی، حکیم یوسف حسین خاں، رشا ضیمی، پرنس سیادت علی خاں صاحب، خیرات ندیم، اوج یعقوبی، قدر عریضی، عباس حسین راسخ، عشرت کرتپوری، میر و نظیر حسین ریحانی، مرزا سرفراز علی، غازی جلیلی، اثر صدیقی، وغیرہ نے غالب کی طرح "پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے" پر اور دکن کے منفرد شاعر جناب خورشید احمد جامی، نوجوان سال نقاد ڈاکٹر مغنی تبسم اور الحاج شمس الدین تابش نے غیر طرحی دور میں کلام سنایا۔ (میر علی خاں)

شاہ جہاں پور میں یوم غالب

مارچ ۱۹۶۹ء ۷ بجے شب کو غالب ڈے خالد رشید ایم۔ اے۔ بی لیکچرر گاندھی فیض عام کالج کے مکان پر زیر صدارت علامہ اختر علی تلہری منعقد ہوا۔ اس میں شہر کے ممتاز حضرات بہاری صاحب الحاج پنڈت بشیر الدین صاحب، مولانا محسن حسین صاحب مفتی شہر، جناب شرافت اللہ خاں، حکیم یوسف علی صاحب۔ ریاست خاں صاحب ایم اے۔ صادق صاحب بی اے وغیرہ نے شرکت فرمائی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر آفتاب اختر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ لیکچرر گاندھی فیض عام کالج نے غالب کی خصوصیات پر مقالہ پڑھا۔ اس کے بعد شوکت صدر جلسہ نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ بیشتر شعراء نے نعتیہ و منظومات کے ذریعہ سے غالب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ عابد میانی، شفیق میانی، شفق بدایونی، خالد رشید بادہ بنگوی، معارف جائسی۔

رضا بجنوری، رباب رشیدی، شفیع اکمل قادری، حامد شاہجہانپوری، عزیز شاہ جہان پوری، شاغل شاہ آبادی، مسرور شاہ جہان پوری، طرب لکھنوی، جاوداں لکھنوی، ایمپلائمنٹ آفیسر شاہ جہاں پوری وغیرہ
(شفیق مینائی سکریٹری خیابان ادب شاہجہانپور)

صفحہ ۶ سے آگے

۲۲ر فروری ۱۹۱۳ء سے ہمدرد کا ایک دورقہ "نقیب ہمدرد" کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا۔ تب تک بیروت سے ٹائپ کی مشین نہیں آپائی تھی اور چھپائی کا انتظام مکمل نہیں ہوا تھا۔ مئی ۱۹۱۳ء تک یہ انتظامات مکمل ہوسکے اور یکم جون ۱۹۱۳ء سے ہمدرد اپنے پورے حجم کے ساتھ شائع ہونا شروع ہوا۔ اور قاضی صاحب نے بھی مولانا محمد علی کے مددگار کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔

قاضی صاحب کا لکھا ہوا سب سے پہلا اداریہ "ہمدرد" کی پہلی جلد کے آٹھویں شمارے میں یعنی ۱۰ر جون ۱۹۱۳ء کو شائع ہوا۔ جس کا موضوع "مصر" تھا۔ یہ اداریہ قاضی صاحب نے کس طرح لکھا تھا اور مولانا محمد علی اپنے شاگردوں کی تربیت کس طرح کیا کرتے تھے اس کا ذکر قاضی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کیا ہے۔

"..... دس بارہ کتابیں مجھے دی گئیں تھیں تاکہ میں ان سب کو پڑھوں، کچھ نوٹ خود محمد علی نے لکھوائے تھے آٹھ دس دن تک میں لکھنے کی تیاری کرتا رہا پھر جب ایک حصہ لکھ لیا تو مسودہ ان کے پاس لایا۔ مجھے یاد ہے کہ چند سطریں پڑھنے کے بعد انھوں نے منہ بنایا، اور یہ کہہ کر مسودہ پھینک دیا کہ یہ کیا فضولیات گھسیٹ لائے ہو۔ میں کیا لکھوں کہ اس دن ایک عام کارکن نوجوان کی کس قدر دل شکنی ہوئی جس کو اپنے خیال میں بڑا ناز تھا کہ وہ ہمدرد کے ادارتی شعبہ میں بغیر اپنی خواہش کے اصرار کے ساتھ شریک کیا گیا ہے"

قاضی صاحب کو یہ اداریہ کئی مرتبہ لکھنا پڑا تھا۔ تب جاکر مولانا محمد علی کو پسند آیا تھا۔ انھوں نے پڑھا اور قاضی صاحب کو گلے لگالیا۔ مولانا محمد علی مرحوم کا اپنے نوجوان مددگاروں کو صحافت کے ابتدائی اصول سکھانے کا طریقہ کار قاضی صاحب کے الفاظ میں یہ تھا۔

"..... ہر روز شام کو شعبہ ادارت کے اراکین کی ایک مجلس مشاورت چیف ایڈیٹر کے کمرہ منعقد ہوتی تھی۔ اس مجلس میں مرحوم اپنے ہر مددگار کے لیے ایک مضمون تجویز کرتے تھے اور پھر اس مضمون کے متعلق بہت سی کتابیں اپنے کتب خانے سے نکال کر دیتے تھے ان کے خاص خاص ابواب اور صفحات کی نشاندہی کرتے تھے اور بار بار اس اصول کو ذہن نشین کرایا کرتے تھے کہ لکھنے سے پہلے اور لکھنے سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ بعض وقت دس بارہ کتابیں پڑھنے کے بعد ایک اداریہ لکھنا ہوتا تھا"[1]

یہ تھا ہمدرد دفتر کا وہ اخباری و صحافتی ماحول اور مولانا محمد علی کی ہدایتیں جن کے سائے میں قاضی عبد الغفار کی باقاعدہ صحافت نگاری کا آغاز ہوا۔

---

[1] ماہنامہ حریت دہلی، ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۴ء

پروفیسر آل احمد سرور

میرا صفحہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

ابراہیم القاضی ڈائرکٹر نیشنل اسکول آف ڈراما نے بحث کا آغاز کیا۔ القاضی نے اب تک بہت سے ڈرامے نہایت کامیابی سے پیش کئے ہیں۔ انھیں اسٹیج کی ضروریات، ڈرامائی مواقع، فضا اور کردار نگاری کے نکتوں کا پورا احساس ہے۔ ان کے یہاں فن کا ایک وقار ہے جو بعض لوگوں کو غرور نظر آتا ہے۔ ہاں اپنے آپ کو لئے دئے ضرور رہتے ہیں۔ بڑی اچھی انگریزی بولتے ہیں۔ انھوں نے بڑی کام کی تقریر کی۔ پہلے تو انھوں نے اس پر زور دیا کہ صرف ڈراما ہی پس ماندہ نہیں ہے بلکہ آج ہمارا سارا ہم عصر ادب دوسرے ملکوں کے ادب کے مقابلے میں پس ماندہ ہے۔ پھر انھوں نے اصرار کیا کہ ڈراما کو صرف ادب نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ اسٹیج کے جو تقاضے ہیں ان کی روشنی میں اس کی اپنی ضروریات کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ ڈراما کا سروکار اس تبدیلی سے ہے جو آج اور کل کے درمیان ہو رہی ہے یا ہونے والی ہے۔ آج لوگوں کی شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ڈراما اس حقیقت سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ اسٹیج کا مقصد صرف ساز و سامان یا آرائش کے ذریعہ سے دیکھنے والوں کو متاثر کرنا نہیں ہے بلکہ کچھ ذہنوں میں ہونے والی تبدیلیوں کو اداکاری کے ذریعے سے عام کرنا ہے۔ انھوں نے اپنی سرزمین سے رشتے کی بھی بات چھیڑی اور مغرب کی سستی نقالی کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے لوک ناٹک آج بھی معنی رکھتے ہیں اور ان سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ ڈراما کے لئے عوام سے رشتے کی بنیاد ضروری ہے۔ آج ہندوستان میں پتھر کے دور سے لے کر جیٹ ہوائی جہاز کے دور تک کی زندگی ملتی ہے۔ اس کے تضاد اور دھوپ چھاؤں کو واضح کرنا ضروری ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم محض سیاسی یا معاشرتی موضوعات پر ڈرامے لکھیں۔ اب تک ان موضوعات پر جو ڈرامے لکھے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان چیزوں کو فن کی ضروریات کے مطابق پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ ناپختگی اور ذہنی ہیجان عام ہے۔ نفسیاتی ڈراما ہر مرض کی دوا نہیں ہے۔ مصنفین کو اور زیادہ ذہنی صلاحیت کا ثبوت دینا ہے۔ القاضی نے ایک باشعور ہدایت کار کی حیثیت سے ڈراما لکھنے والوں کو اپنی سرزمین اور اپنی فضا جذب کرنے اور اپنی زندگی کے تضادات واضح کر کے اپنی بصیرت کا ثبوت دینے کی ہدایت کی۔ ان کی تقریر بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنی گئی۔

ان کے بعد شمبھو مترا نے تقریر کی جو بنگالی کے مشہور ہدایت کار ہیں۔ شمبھو مترا نے آج کے مصنفین کی اپنی سرزمین اور اپنے سرمائے سے ناواقفیت پر خاص طور سے زور دیا۔ انھوں نے بتایا کہ بہت سے مصنفین یہ نہیں جانتے کہ ایک ناٹک کے کتنے حصے ہوتے ہیں اور ہر حصے کا نام کیا ہے۔ مگر لاکھوں کی زندگی پر ڈرامے لکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جب تک ہم لوگ اپنے سارے تہذیبی اور ادبی سرمائے سے واقف نہیں ہوں گے، ہم آج کل کی زندگی کو بھی ڈرامائی انداز سے پیش نہیں کر سکتے۔ ان کے بعد امرت لال ناگر اور راجندر ناتھ اشک نے تقریریں کیں۔ ناگر نے بعض کام کی باتیں کہیں، مگر اشک زیادہ تر اس بات کا رونا روتے رہے کہ انھوں نے بہت سے ڈرامے لکھے ہیں مگر ہدایت کار ان کے ڈراموں کو وہ اہمیت نہیں دیتے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اشک سے توقع تھی کہ وہ محض اپنے ڈراموں کی بات نہیں کریں گے بلکہ ڈراما میں مجموعی طور پر آج جو کمی ہے اس کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔ اس کے بعد تامل کے ایک ادیب نے تقریر کی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ ایک انگریزی کا ترجمان لائے تھے۔ ایک دو جملے وہ تامل میں کہتے تھے، ترجمان انگریزی میں ترجمہ کرتا جاتا تھا۔ ہم سب کو یہ احساس ہوا کہ ابھی تک صرف انگریزی ہی ایسی زبان ہے جس کے ذریعہ سے تمام ملک کے ادیب اور فنکار ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے ہیں۔

دوپہر ہو گئی تھی اس لیے لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے کیونکہ سہ پہر میں جنرل کونسل کی میٹنگ تھی۔ چوتھی جنرل کونسل کا پہلا اجلاس ۳ بجے راشٹرپتی بھون میں ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ نے صدارت کی۔ انھوں نے اجلاس کا صدر ہونا منظور کر لیا تھا۔ اس اجلاس میں آٹھ ممتاز ادیبوں کا کونسل کے لیے انتخاب ہوا، بجٹ منظور ہوا اور ایگزیکیٹو بورڈ کے ممبروں کا انتخاب ہوا۔ میرے قریب بنگال کی ایک ممتاز ادیبہ لیلا مجمدار بیٹھی تھیں۔ جب یہ سوال اٹھا کہ پنجابی کی نمائندگی پروفیسر موہن سنگھ کریں یا امرتا پریتم تو لیلا مجمدار نے کہا کہ میں تو ایک خاتون کی حمایت کروں گی۔ میں نے کہا یہ ہم مردوں پر چھوڑ دیجئے آپ موہن سنگھ کی حمایت کیجئے۔ بالآخر موہن سنگھ نے خود امرتا پریتم کے حق میں اپنا نام واپس لے لیا۔ اردو کی نمائندگی کے لیے اختر اورینوی نے میرا نام پیش کیا جس کی تائید ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کی۔ جلسہ گھنٹے بھر میں ختم ہو گیا اور انعامات کی تقریب ایک گھنٹے بعد تھی۔ اس لئے ہم لوگ راشٹرپتی بھون کے باغ کی سیر کو نکلے۔ امرتا پریتم، موہن سنگھ، اختر اورینوی اور میں باتیں کرتے رہے۔ اس وقت باغ پر بہار تھی۔ رنگ برنگ کے پھول، صاف ستھرا ترشا ہوا سبزہ، جا بجا فوارے۔ سبھی متاثر ہوئے مگر پھر پھر کر گفتگو موجودہ دور کی مشکلات، لسانی تنگ نظری، ہندوستان کی سالمیت کو خطرہ، اخلاقی قدروں کے زوال، طلبہ کی شورش اور ارباب اقتدار کی بے حسی کے موضوعات پر ہوتی رہی۔ امرتا پریتم نے میری دعوت پر علی گڑھ آنا منظور کر لیا ہے۔ ان کے گیتوں اور افسانوں سے اردو والے ابھی تک ناواقف ہیں۔ موہن سنگھ پنجابی کے سب سے اچھے شاعر کہے جا سکتے ہیں۔ ہم دونوں نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ اردو اور پنجابی میں جن مصنفین کو انعام دیا گیا ہے وہ نوجوانوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

ساڑھے پانچ بجے تقسیم انعامات کے لیے سب اشوک ہال میں جمع ہوئے۔ ہر مصنف کا ہندی میں تعارف ہوا۔ ذاکر صاحب نے انعامات دئے اور پھر ایک مختصر تقریر کی جس میں ادیبوں سے اپیل کی کہ اعلیٰ معیاروں پر نظر رکھیں اور اپنی تحریروں سے انسانیت کی خدمت کریں۔ تقریب کے بعد انعام یافتہ ادیبوں کے گرد خاصا ہجوم رہا۔

ساہتیہ اکاڈمی مجموعی طور پر ہندوستانی ادب کی خاصی خدمت کر رہی ہے۔ اس کے ذریعہ سے نہ صرف ہر زبان کے کچھ شاہکار سامنے آتے ہیں، نہ صرف ادیبوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے بلکہ ایک زبان کے ادیب کو دوسری زبانوں کے ادیبوں سے ملنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ اس ارتباط ذہنی سے جو وحدت نظر پیدا ہو سکتی ہے وہ سب سے بڑی چیز ہے۔ ہاں اکاڈمی کو سال میں دو بار باقاعدہ سمینار بھی کرنے چاہئیں۔ صرف سال میں ایک دفعہ ادیبوں کا ملنا کافی نہیں۔ کئی دن تک باقاعدہ ایک موضوع پر بحث و مباحثہ بھی ضروری ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر نصیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا